اقبال کی شاعری:فکری واسلوبیاتی پس منظر

ڈاکٹر عابد سیال*

Abstract:

If on the one hand, the social and political development of the 19th century had an impact on the evolution of Iqbal's poetry, certain literary figures of the time had an equally important role to play. The names of Ghalib, Hali & Akber Ilahabadi are worth mentioning in this case. This article is an attempt to analyze this background of Iqbal's poetry.

برصغیر میں ایک نئے عہد کا آغاز یورپی اثرات کے تحت ہوا۔ ۲۷ مئی ۱۴۹۸ء کو واسکوڈے گاما کالی کٹ کے ساحل پر اترا تو یورپی باشندوں کی ہندوستان میں آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تاہم ۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی میں انگریزوں کی فتح انگریزی سامراج کے ہندوستان پر قبضے کا پہلا اہم واقعہ ہے۔ اس وقت کے ہندوستانیوں کے لیے شاید یہ شکست ایک وقتی جنگی تجربہ تھی اور وہ اس شکست کو بعد میں آنے والے اس بڑے سیاسی اور تمدنی انقلاب کے تناظر میں دیکھنے کے قابل نہ تھے۔ تاہم بعد کے ایک سو سال میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تمدنی منظرنامے کی تشکیل کا پیش خیمہ بجا طور پر جنگِ پلاسی کی شکست کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

انگریزوں سے پہلے بھی برصغیر غیر ملکی حملہ آوروں سے محفوظ نہ تھا۔ مختلف اوقات میں شمال اور جنوب سے آنے والے حملہ آوروں کی یلغار برصغیر کے سیاسی اور سماجی ماحول پر اپنے اثرات مرتب کرتی رہی لیکن اس کے باوجود یہ سرزمین مجموعی طور پر کسی نہ کسی حد تک اپنی تہذیبی شناخت برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ البتہ انگریزوں کے تسلط کے بعد یہاں ایسے رویوں نے فروغ پایا جن کی بدولت ہندوستان اپنی تاریخ کے ایک بالکل نئے دور میں داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر محمد خان اشرف کی رائے میں:

''انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان قرونِ وسطیٰ کے دور میں تھا۔ اس کا

* اُستاد شعبہ اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ڈھانچہ جاگیردارانہ تھا جو ذاتی و شخصی وفاداری اور انعام واکرام کی بنیاد پر استوار تھا۔ انگریز ایک نئے عہد کے نقیب اس لیے ثابت ہوئے کہ وہ اپنے ہمراہ صنعتی انقلاب اور جمہوری و غیر شخصی نظامِ حکومت کے جراثیم لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کا یہاں وجود، ان کا نظامِ سلطنت، تجارتی و صنعتی مقاصد، طریق اور حربے، ان نئے سیاسی و معاشی اثرات کے فروغ کا باعث بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی زبان وادب ایک نئے فکری و تمدنی انقلاب کو ہمراہ لے کر آئے۔''(۱)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان ان رویوں سے آشنا ہو چکا تھا جو آگے چل کر 'جدید ہندوستان' کی تشکیل کرنے والے تھے۔ سیاسی اور سماجی سطح پر آہستہ آہستہ ابھر کر ایک طوفان کی شکل اختیار کر جانے والی کش مکش کا نقطۂ عروج ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی شکل میں گزر چکا تھا اور نئے سیاسی اور سماجی حالات میں نئے فکری رجحانات فروغ پا رہے تھے۔ اس دور کی سب سے اہم تحریک سرسید تحریک ہے جس نے اہلِ ہندوستان کو بدلتے ہوئے حالات اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی راہ دکھائی۔ سرسید تحریک کا مقصد ایک ہمہ جہت اصلاح تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

''اس تحریک کو اصلاحی تحریک کا نام بھی دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اصلاح کو محض اخلاقیات تک محدود نہ سمجھا جائے بلکہ اس میں پیرویٔ مغربی کے ساتھ ساتھ سماجی انجماد کو دور کرنے کی کاوش اور اسلام کے دورِ زرّیں سے ہم رشتہ ہونے کے میلان کو بھی شامل کر لیا جائے۔''(۲)

سرسیّد تحریک کا محوری نکتہ حقیقت پسندی ہے جو اس کی تمام جہات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مذہبی سطح پر اس تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں کو رسوم و روایات کی جکڑ بندی سے آزاد کر کے مذہبی عقائد اور تعلیمات کو شعور کی آنکھ سے دیکھنے اور دکھانے کی سعی کی۔ سماجی سطح پر سرسید کی تحریک نے ہندوستان کے لوگوں کو موجود سماجی رسم و رواج کو چھوڑ کر جدید مغربی طرزِ زندگی کو اپنانے اور نئی تہذیبی قدروں کی تشکیل پر زور دیا۔ علمی سطح پر اس تحریک نے مغربی علوم سے استفادہ کر کے دنیائے جدید کے حقائق سے آگاہی کی تلقین کی۔ ادبی سطح پر سرسید کی تحریک نے ایک طرف مغرب کی جدید اصناف کو قبول کرنے پر زور دیا اور دوسری طرف اس آرائشی اسلوب کا چغہ اتار پھینکنے کی سعی کی جو مافی الضمیر کی ترسیل میں رکاوٹ تھا اور اس کی جگہ سادہ بیانی کی ترغیب دی تاکہ بات دل سے نکلے اور دل میں جا بیٹھے۔

بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو برصغیر سیاسی اور سماجی سطح پر انقلابات کی زد پر تھا۔ اس صدی کا آغاز

برصغیر کے لوگوں کے لیے ایک ایسا تاریخی موڑ تھا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان کے لیے بالکل انوکھا تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز پوری دنیا کے ساتھ ساتھ برصغیر میں بھی سیاسی تبدیلیوں کا دور تھا۔ ہندوستان میں جنگ عظیم سے پہلے تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی۔ لوگوں کا جذبۂ حریت جاگ چکا تھا اور خود مختاری کا تصور پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جو اہلِ ہندوستان کی نمائندہ سیاسی جماعتیں تھیں اور ہندوستان کی آزادی ان کے قیام کا بنیادی مقصد تھا۔ اسی دوران جنگ عظیم کی قیامت برپا ہوئی اور اس کے اختتام پر روس کی زاریت تباہ ہوگئی اور اپنے وقت کے عظیم شہنشاہوں کی کج کلاہیاں باقی نہ رہیں۔ دیگر ملکوں میں بھی انقلاب پر انقلاب برپا ہو رہے تھے۔ ترکوں نے خلافت کا جامہ اتار پھینکا اور جمہوریت کی بنا ڈالی۔ ایران نے بھی شہنشاہیت کی بجائے جمہوری نظام کو پسند کیا۔ ان تمام تبدیلیوں کے بہت گہرے اثرات ہندوستان میں منتقل ہوئے اور یہاں ایک نئے عالمی سیاسی شعور نے جنم لیا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس دور کے اہم سیاسی اور سماجی واقعات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''بیسویں صدی کے آغاز اور پہلی جنگ عظیم تک برعظیم کو جن سیاسی اور سماجی حالات سے دوچار ہونا پڑا اور جو اردو شاعری میں بھی منعکس ہوئے، ان کی مختصر سی فہرست یہ ہے: وطن اور وطنیت کا تصور، سیاسی محکومی کا شدید احساس اور جذبۂ آزادی کی تڑپ، ملکی باشندوں کی نااتفاقی اور اس کا اثر اجتماعی زندگی پر، اسلامیانِ ہند کی نئی کروٹ اور علی گڑھ تحریک کا ردِ عمل، اتحادِ اسلام دور، نئی روشن خیالی کا ظہور، تحریک ہوم رول وغیرہ۔''(۳)

ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک پر حکومت کرنے کے لیے انگریزوں کے اپنے لوگوں کی محدود تعداد انتہائی ناکافی تھی اس لیے انھوں نے ہندوستان ہی کے لوگوں کو اس کام کے لیے منتخب کیا اور اس کے اہل وہ ہندوستانی قرار پائے جو انگریزی زبان جانتے تھے۔ اس امر نے مقامی لوگوں کو انگریزی سیکھنے کی طرف رغبت دلائی۔ اس کے علاوہ سرسید اور بعض دیگر ہندوستانی لیڈروں نے حاکم و محکوم کے درمیان رابطے کے لیے انگریزی زبان کو مؤثر وسیلہ سمجھتے ہوئے ہندوستانیوں کے لیے اس کی تعلیم پر زور دیا۔ ان وجوہات کے نتیجے میں ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ اس تعلیم اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی ملازمتوں کی بنا پر ہندوستان میں ایک نیا ملازمت پیشہ طبقہ پیدا ہوا جس کی عادات واطوار، اندازِ گفتگو، اقدار اور مسائل مختلف تھے۔ یوں ہندوستان کا معاشرتی ڈھانچا نئی تبدیلیوں سے آشنا ہونے لگا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل کی تحریکوں کا بنیادی رجحان اصلاح اور حقیقت پسندی کا تھا۔ اس ضمن میں علی

گڑھ کے علاوہ دوسری اہم تحریک ''انجمن پنجاب'' ہے جس نے ادب اور بالخصوص شاعری کے میدان میں حقیقت پسندانہ رویے کے فروغ کی سعی کی۔ اس تحریک نے بھی ادب کے مشرقی خزائن کے ساتھ ساتھ مغربی علوم سے استفادے اور مغربی اصنافِ ادب کی خوشہ چینی کی ترغیب دی۔ انجمن پنجاب میں کی گئی آزاد کی تقریر کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''............ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہارِ اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں، لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے، فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار، طرے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور بے چاری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر کھڑی ہے کہ کوئی صاحبِ ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔''(۴)

اس اقتباس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اہلِ ہندوستان میں نئے علوم اور نظریات کا خیر مقدم کرنے کا رجحان بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا بیسویں صدی کے آغاز پر عالمی سیاسی تبدیلیوں کے زیرِ اثر برصغیر میں جدید علوم نہ صرف متعارف بلکہ مقبول بھی ہوئے۔ مختلف شعبۂ ہائے علم میں ہونے والی تحقیق کے نتیجے میں دنیا جن جدید نظریات سے آشنا ہوئے ان کے اثرات برصغیر تک بھی پہنچنے لگے۔
ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں کہ:

''بیسویں صدی کا طلوع زندگی کی کئی مثبت اقدار اور جہد کے میلانات کو ساتھ لایا۔ سماجی سطح پر بھی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سیاسی سطح پر آزادی کی تحریکوں اور مجموعی تحرک نے ادب میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی کا دروازہ وا کیا۔''(۵)

ان اثرات کے نتیجے میں ہندوستان کا ادب خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر متاثر ہوا یعنی اس میں ہیئتی تبدیلیاں بھی وقوع پذیر ہوئیں اور فکری اور موضوعاتی حوالے سے اس کا داخل بھی بدلنے لگا۔

سائنس اور فلسفے کے میدانوں میں ہونے والی عالمی پیش رفت کے اثرات برصغیر میں پہنچنے تو لگے لیکن اپنے مخصوص علمی و فکری پس منظر کی وجہ سے اہلِ ہندوستان کے لیے ان حقائق کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ اس کا نتیجہ ایک قسم کے ذہنی دباؤ اور بے یقینی کی شکل میں سامنے آیا۔ ادیبوں نے اس کا ایک حل یہ نکالا کہ رومانوی رویوں میں پناہ لی۔

ڈاکٹر وزیر آغا مندرجہ بالا صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی سرسید احمد خاں کی ادبی تحریک کو ایک ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ اسی دوران میں سارا ہندوستان سیاسی طور پر فعال ہو گیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ ایسے سیاسی ادارے میدان میں اتر آئے اور انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ یورپ میں پہلی جنگ عظیم لڑی گئی جس نے انسانی اقدار کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ علوم کی ترقی نے انسان کے سارے تیقن کو پارہ پارہ کر دیا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ مرکزِ کائنات نہیں بلکہ وسیع بیکراں کائنات میں ایک نہایت غیر اہم بلکہ نظر تک نہ آنے والے سیارہ کا باسی ہے۔ مزید برآں اس کے ہاں یہ خیال بھی راسخ ہونے لگا کہ وہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں'' ایسی کیفیت کی زد پر ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اس احساس نے اس کے تیقن اور خود اعتمادی کو سخت دھچکا پہنچایا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ ماحول کے ساتھ اس کا رشتہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ جب وہ بنیاد ہی لرزہ براندام ہو جس پر معاشرے کی عمارت کھڑی ہے تو انسان قدرتی طور پر متخیّلہ کو بروئے کار لاتا ہے تا کہ ایک بہتر اور خوب تر جہان کا نظارہ کر سکے۔ ایک ایسا جہان جو پرانے جہان کے اسقام سے پاک ہو، لہٰذا ایک خیالی جنت یا یوٹوپیا کا تصور جنم لیتا ہے۔ بیسویں صدی کے اس ابتدائی دور میں اردو ادب میں رومانی تحریک نے جنم لیا جو ایک طرف تو سرسید کی تحریک کا ردِعمل تھی اور دوسری طرف ایک نئے جہان کی دریافت پر مائل تھی۔''(۶)

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ سرسید کے عہد ہی سے رومانوی رویوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا تاہم ان کی کوئی ایسی اجتماعی صورت نہ بنی تھی جو غیر معمولی ہو۔ ان رویوں میں سے اکثر، لکھنے والوں کی اپنی افتادِ طبع کا نتیجہ تھے۔ تاہم یہ انفرادی کوششیں اجتماعی صورت اختیار کرنے کے لیے موزوں ماحول کے انتظار میں تھیں۔ سیاسی، سماجی اور فکری انقلابات کے نتیجے میں جب ادب نے موضوعاتی اور فنی سطح پر نئی کروٹ لی تو ان رویوں نے تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

بیسویں صدی کے آغاز پر ہندوستانی مسلم فرد کا جو ذہن بنا اس کے سیاسی، سماجی، علمی و ادبی اسباب و محرکات پر گذشتہ سطور میں بات کی گئی ہے۔ اقبال کے فکر و فن بھی اسی دور میں اپنے ارتقا کی ابتدائی منزلیں طے کرتے ہیں اس لیے ان کی ابتدائی شاعری بھی انھی اثرات کی زائیدہ ہے جن کے تحت اس دور کے اکثر لکھنے والے اپنا اظہار کرتے رہے۔ اس دور میں تین رویے نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں: اوّل رومانوی رویہ، دوم اصلاح پسندی اور قومی و ملی شاعری کا رویہ اور سوم سماجی حقیقت نگاری کا رویہ۔ رومانوی اور اصلاحی رویوں نے بالعموم شاعری کو اور سماجی حقیقت

نگاری کے رویے نے فکشن کو متاثر کیا۔شاعری کے اسی ماحول میں اقبال کی تخلیقی شخصیت نمو پاتی ہے۔

اقبال نے اپنے قابل اساتذہ کے طفیل اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے اردو اور فارسی کی شعری روایت کا گہرا شعور حاصل کر لیا تھا۔ان کے استاد مولوی میر حسن اردو اور فارسی ادب کا وسیع مطالعہ اور ذوق رکھتے تھے۔وہ سر سید سے متاثر اور ان کے خیالات و خدمات کے معترف تھے اور سر سید بھی ان کے قدردان تھے۔اسی طرح انھی غالب سے بھی عقیدت تھی۔غالب سے ان کی عقیدت کے متعلق ایک واقعے کا بیان شاید بے محل نہ ہو کیونکہ یہی ذوق آگے اقبال میں بھی منتقل ہوا۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی بیان کرتے ہیں:

> ''ادبیات کے استاد کے لیے، وسعتِ مطالعہ کے علاوہ ادبی ذوق اور مذاقِ سخن سے بہرہ مند ہونا بھی ضروری ہے۔شعر و ادب سے شاہ جی (مولوی میر حسن) کے فطری لگاؤ اور ان کی بلند مذاقی کا اوّلین ثبوت ہمیں ان کی نوجوانی کے اس واقعے سے ملتا ہے کہ غالب اور کلامِ غالب کی قدرشناسی کا جذبہ انھیں ۱۸۶۳ء میں کشاں کشاں دلّی لے گیا۔اس زمانے میں جب سفر کی موجودہ سہولتیں حاصل نہیں تھیں، انھوں نے سیالکوٹ سے انبالے تک گھوڑے پر سفر کیا۔کہیں کہیں پیدل بھی چلنا پڑا۔یہ تمام صعوبتیں جھیل کر وہ اس شاعرِ اعظم کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے جو عمر بھر ناقدریٔ ابنائے زماں کا شکوہ سنج رہا۔''(۷)

قومی دردمندی اور فکری شاعری سے عقیدت کا یہی ذوق اقبال میں منتقل ہوا۔فلسفے اور اسلامی تاریخ و ثقافت کا ذوق انھیں پروفیسر آرنلڈ سے ملا۔''پروفیسر آرنلڈ کی زندگی، طالب علمی کے مراحل سے لے کر عمر کے آخری لمحے تک مطالعے اور تحقیق میں گزری لیکن خاص بات یہ ہے کہ ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے وسیع دائرے کا محور اسلام، تاریخِ اسلام و اسلامی ثقافت رہا ہے۔''(۸) ان کے علاوہ بھی اقبال نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں کئی اساتذہ سے کسبِ فیض کیا جس کے نتیجے میں ان کے فکر و فن کو جلا ملی۔

اُردو شاعری میں اگر اقبال کے پیش رووں کے طور پر دیکھا جائے تو تین نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں: حالؔی، اکبؔر اور غالبؔ۔حالؔی اور اکبؔر کسی حد تک اقبال کے ہم عصروں میں سے ہیں جبکہ غالبؔ سے اقبال کا استفادہ ان کے کلام کے حوالے سے ہے۔

حالؔی نے سر سید تحریک کے مقصدی نقطۂ نظر کے زیرِ اثر ادب میں ایک سنجیدہ عقلیت اور سماجی پس منظر کی اہمیت پر زور دیا۔انھوں نے شاعری کو علمِ اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام قرار دیا(۹) تاہم ان کے ذہن میں

اخلاق کا مفہوم وسیع تھا۔ حالؔی نے شاعری کی اساس حقیقی جذبات و احساسات پر رکھنے، تخیل کی بلندی اور قدیم اسالیب و اصول کے دائرے وسیع کرنے پر بھی زور دیا۔ وہ معاشرے کے لیے نفع بخش ہونے کو شاعری کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی رائے میں:

''جو شخص اس عطیۂ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا، ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔''(۱۰)

اسی طرح انھوں نے شاعری کا مواد بھی اپنے ماحول ہی سے اخذ کرنے پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صد ہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعہ کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا؟ یا کسی واقعے کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہو گا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے دلچسپ میٹریل غزل کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔''(۱۱)

یوں انھوں نے غالبؔ اور شیفتہؔ کی صحبتوں سے سیکھی ہوئی حقیقت پسندی اور سرسیّد تحریک کی مقصدیت کے امتزاج سے نئی شاعری کے اصول متعین کرنے کی کوشش کی۔ بقول ڈاکٹر شیخ عقیل احمد:

''حالؔی کی اس جرأتِ رندانہ نے اردو غزل کے شاعروں کو یہ احساس دلایا کہ طرزِ فکر و طرزِ ادا میں تبدیلی ناگزیر ہے۔''(۱۲)

حالؔی کی اس ساری کوشش کے پیچھے دراصل قومی دردمندی بطور محرّک کے کارفرما تھی اور وہ شاعری کو اپنی قوم کی فلاح اور بہتری کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کے ہاں بغاوت سے زیادہ اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اقبال بھی فطری طور پر جدت پسند تھے لہٰذا شاعری کے متعلق حالؔی کی اکثر اصلاحی تجاویز سے ان کا اثر قبول کرنا اچنبھے کی بات نہیں۔ حالؔی کی قدیم رنگ کی غزل بھی کافی حد تک انھی خصوصیات کی حامل تھی جس کا پرچار انھوں نے مقدمۂ شعر و شاعری میں کیا، تاہم بعد کی غزلوں میں انھوں نے التزام سے ان اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے غزل کے جدید رنگ کا ایک نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مصلحانہ جوش اور جلد بازی میں کہی ہوئی حالؔی کی یہ اصلاحی غزل فنی نقطۂ نگاہ سے اعلیٰ درجے کی نہیں کہی جا سکتی تاہم جدید غزل کا پہلا سنگِ میل ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے:

''حالؔی نہ ہوتے تو غزل ترقی کی منزلیں اتنی تیزی کے ساتھ طے نہ کر پاتی اور

جدت کی اس فضا کا پیدا ہونا اس میں مشکل ہو جاتا جو آج اس کا طرۂ امتیاز ہے۔"(۱۳)

غزل میں حالی کے اس تجدّد کا اعتراف ڈاکٹر رشید امجد نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> "حالی پہلی بار مجدّد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ وہ غزل کے بدھ تھے کہ انھوں نے پرانے محل تیاگ کر گیان کی نئی راہ تلاش کی۔ انھوں نے غزل کو روایت اور تکنیک کے تنگ، تاریک اور اندھے سانچے سے نکالنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔۔۔ان کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے موضوعاتی کینوس کو وسیع کیا۔"(۱۴)

اکثر ناقدین اس رائے پر متفق ہیں کہ حالی نے جس نئی غزل کا ڈول ڈالا تھا اس کی کامل ترین صورت اقبال کے ہاں نظر آتی ہے۔ چنانچہ اردو شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

> "ناسخ و آتش کے بعد آزاد و حالی نے پھر اردو شاعری پر اثر ڈالا۔ اس دفعہ زبان سے زیادہ خیالات متاثر ہوئے کیونکہ لکھنوی شعراء نے زبان پر اتنا زور دیا تھا کہ اس کا ردِعمل ہونا ضروری تھا۔ مطالب و معانی کی خوبیوں کا اتنا خون ہوا تھا کہ اس کا رنگ لانا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ اس دور کی اردو شاعری اپنے عہد کی زوال پذیر معاشرت کی ترجمان تھی، اس لیے اس میں وہ تمام عناصر راہ پا گئے جو قوموں کو ترقی سے زیادہ تنزل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حالی اور آزاد نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنی اپنی حد تک اپنے مقصد میں کامگار رہے۔ لیکن جس طرح مرزا مظہر جان جاناں کی تحریک میر و سودا کی وجہ سے کامیاب ہوئی اور اردو شاعری کی شکل بدل گئی، بالکل اسی طرح حالی اور آزاد کی اصلاحی کوششیں آج کلام اقبال کی وجہ سے تکمیل کو پہنچ رہی ہیں۔"(۱۵)

نظیر صدیقی نے بھی اقبال کی غزل کی تعریف کرتے ہوئے حالی کا ذکر ان سے پہلے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "حالی کے بعد جس شخص نے غزل میں سب سے بڑا انقلاب پیدا کیا وہ اقبال ہیں۔"(۱۶) مجموعی طور پر اقبال کے فکر و فن میں حالی سے جو استفادہ نظر آتا ہے اس میں قومی و ملی دردمندی؛ شاعری کی مقصدیت، سادگی اور اصلیت: اور لفظ سے زیادہ معنی پر توجہ شامل ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی، حالی اور اقبال کے درمیان کی کڑی ہیں۔ اکبر اپنے وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کے ایک بالغ نظر نقاد کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے مغربی تہذیب کی یلغار کے منفی اثرات کا نہ صرف بروقت ادراک کیا بلکہ اس کے خلاف مؤثر آواز بھی اٹھائی۔ اکبر جدید تعلیم اور ترقی کے مخالف نہیں تھے تاہم اپنی تہذیب و روایات سے دستبردار ہو کر ترقی کی دوڑ میں شامل ہونا ان کے لیے قابلِ قبول نہ

تھا۔ ان کو زندگی کا مشرقی نقطۂ نظر عزیز تھا۔ ان کے اس نقطۂ نظر کے بارے میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی رقم طراز ہیں:

> ''اکبرؔ کا نظریہ یہ تھا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان فرق پوری زندگی کے بنیادی نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ پوری زندگی کے فلسفہ کا فرق ہے۔ مشرق میں زندگی کا تصور ماورائی ہے۔ ذہن انسانی لامحدود قوتوں کا حامل ہے اور دنیا کی مادی حقیقتوں سے لے کر ماورائی حقیقتوں تک اس کی پہنچ ہے مگر مغرب کا مادی فلسفہ اس کی نفی کرتا ہے۔''(۱۷)

انگریزوں کے غلبے کے اس دور میں ہندوستانی مسلمانوں میں زیادہ تر دو قسم کے شدید رویے پیدا ہوئے۔ ایک مغربی تہذیب کی کُلّی مخالفت اور انگریزوں اور مغرب سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے گریز کا رویہ اور دوسرا اس کے برعکس یعنی مغرب کی ہر چیز کو بلا سوچے سمجھے قبول کرنے اور اس کی پیروی اور نقل کرنے کا رویہ۔ یہ دونوں رویے غیر مفید تھے اس لیے ان میں اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ اکبرؔ نے یہ اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بقول ڈاکٹر وقار احمد رضوی:

> ''اکبر صحیح معنوں میں مصلح تھے۔ وہ اپنے اسلامی جذبے سے مسلمانوں میں ملّی وحدت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ قوم نے یا تو اعلیٰ درجے کے غدّار، سر، خان بہادر، نواب پیدا کیے تھے یا کٹّر قسم کے مولوی۔ ضرورت درمیانی راستے کی تھی۔ اکبرؔ نے اسی اعتدال کی راہ کی طرف نشاندہی کی۔۔۔ اکبرؔ کی غزل اسی توازن و اعتدال کا نمونہ ہے۔۔۔ انھوں نے مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا۔۔۔ اور بتایا کہ اپنی اقدار کو تج کر جس تعلیم سے کلرکی ملے تو یہ سودا بہت مہنگا ہے۔''(۱۸)

ان فکری عناصر کے ساتھ ساتھ اکبرؔ کی غزل کے فنی عناصر میں سے دو کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ اول یہ کہ انھوں نے غزل میں انگریزی الفاظ اور علامتوں کا ذکر بڑی بے تکلفی سے کیا اور غزل کے مخصوص لفظی سانچوں کو توڑنے کی سمت قدم بڑھایا۔ تاہم ان کی یہ کوشش محض ظرافت پیدا کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ مغربی ذہن اور مغربی اقدار کی نمائندگی کرنے والے الفاظ کا استعمال ان کی فکر کے ساتھ ہم رشتہ ہو کر غزل کی معنویت بڑھانے میں معاون بنا۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''انھوں (اکبرؔ) نے جو زبان چاہی استعمال کر ڈالی، جو لہجہ جی میں آیا، اختیار کر لیا۔ انھوں نے ہر بات ہر طریقے سے کہی ہے۔ ثقات کی زبان میں، عوام کی زبان میں، مولویوں کی زبان میں، صوفیوں کی زبان میں، شاعر کی زبان میں اور سب سے بڑی بات یہ کہ شخص کی زبان میں۔''(۱۹)

دوم یہ کہ انھوں نے غزل میں کچھ نئے علامتی کرداروں کو شامل کیا۔ روایتی غزل میں عاشق، معشوق اور رقیب کی تثلیث کے علاوہ ساقی، رند، صیاد، باغبان، اسیر، رہبر، رہزن، مسافر اور دیگر کردار موجود تھے۔ اکبر کی غزل میں ''میر، مرزا، بابو، ملاّ، پنڈت، لالا، لاٹ، مس، چیلا، پروفیسر، بدھو، جمن، حاکم اور محکوم ایسے کردار ہیں جنھیں اکبر نے طبقاتی و سیاسی رویوں کی علامت بنا کر پیش کیا''(۲۰) اور یہ کرداران کے ہاں تواتر کے ساتھ آئے ہیں۔ آگے چل کر اقبال کی غزل میں مردِ مومن، درویش، قلندر، گدا، سلطان، سید، افغان، بلوچ، مردِ کہستانی، بندۂ صحرائی وغیرہ کے کرداروں کے ظہور کو اکبر کی اسی کوشش کی تکمیلی و توسیعی صورت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یوں فکر اور فن دونوں میں اقبال نے اکبر سے استفادہ کیا ہے۔

غالب سے اقبال کا رشتہ معنوی تلمّذ کا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان ہوا، غالب شناسی اقبال میں، اپنے طالب علمی کے زمانے ہی میں، اپنے اساتذہ کے توسط سے پیدا ہوئی۔ اقبال اپنی شاعری کے تشکیلی دور میں بھی غالب سے متاثر ہوئے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''مولانا حالی (اور شاید اس زمانے کے سارے تقاضوں) نے غالب کے انتقال کے بہت جلد بعد غالب شناسی کی ایک نئی تحریک کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جدید تعلیم اور جدید اندازِ نظر نے غالب کو وہ قبولِ عام بخشا کہ اس کے کلام کا مطالعہ وقت کا مقبول ترین ادبی فیشن بن گیا تھا۔ اسی ترقی پذیر غالب پرستی کے زمانے میں اقبال کی شاعری نے پہلی انگڑائی لی اور ادبی ذوق و شوق کی اسی ابتدائی حالت میں اقبال کو غالب کی شاعری میں معنی کے بڑے بڑے طلسمات نظر آئے۔ اس کا اظہار ان کی نظم ''مرزا غالب'' سے ہوتا ہے جس کے ہر ہر شعر سے اقبال کی غالب شناسی اور غالب پسندی کا واضح ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے دل میں غالب کے افکار کی عزت کسی رسمِ عام یا روشِ عام کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس سبب سے تھی کہ انھیں غالب کی شاعری میں ایک ایسا بڑا فنکار نظر آیا جس کے فن کے بعض پہلو خود ان کے اپنے رجحانات کے ہمرنگ تھے۔''(۲۱)

غالب کی غزل کا جو پہلو آنے والی غزل اور خصوصاً اقبال پر سب زیادہ اثر انداز ہوا وہ اس کا تفکر ہے۔ غالب کی غزل اردو میں پہلی مرتبہ ایسی غزل کا کامیاب نمونہ پیش کرتی ہے جس میں دل اور دماغ دونوں کو یکساں شدت کے ساتھ متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اقبال کا غالب سے متاثر ہونا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اقبال کا تفکر اور اندازِ تفکر بیسویں صدی کے انسان کا ہے۔ اور انیسویں صدی میں اگر کوئی نابغۂ تفکّر کے لحاظ سے اس درجے پر پہنچتا

ہے تو وہ غالبؔ ہے۔ غالبؔ کے اس جدید ذہن کا ڈاکٹر وزیر آغا نے یوں تجزیہ کیا ہے:

''اس میں کوئی کلام نہیں کہ غالبؔ دراصل بیسویں صدی کا انسان تھا جو غلطی سے انیسویں صدی میں پیدا ہو گیا اور اس بات کی اسے سزا بھی ملی۔ اس کی شاعری کو مہمل، اس کے اندازِ فکر کو نامانوس اور اس کے اسلوبِ حیات کو قابلِ اعتراض قرار دیا گیا۔ مگر جب غالبؔ تقریباً ایک سو برس کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنوں میں پہنچا تو زمانے نے بانہیں کھول کر اس کا استقبال کیا۔۔۔ غالبؔ کی شاعری جدید ذہن کو اسی لیے عزیز ہے کہ اسے اس میں اپنی یافت اور نایافت، انفرادیت اور اجتماعیت، ذہنی فعالیت اور تخلیقی اپج کے ایک ایسے احساسِ بحر آسا پر منتج ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو بعض اوقات تو کائناتی شعور کے مقام تک بھی جا پہنچا ہے۔۔۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے جیسے ساری جدید غزل غالبؔ کے لہجہ، جہت اور مزاج سے متاثر ہے۔''(۲۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون ''غالبؔ - پیش روِ اقبال'' میں بڑے مفصل اور مدلل انداز میں ان نکات کی نشاندہی کی گئی ہے جو غالبؔ کی غزل کا امتیاز ہیں اور جن سے اقبال متاثر ہوئے۔ ان کے خیال میں غالبؔ اور اقبال کے مشترک خصائص کی فہرست یوں مرتب کی جا سکتی ہے:

۱۔ برجستہ اور جوش انگیز اسلوب

۲۔ ارتقائے حیات کے لیے سخت کوشی اور خارا شگافی کا سبق۔ اقبال کی اصطلاح میں اسے ''ستیز'' کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ جذبہ و تفکر کا اجتماع

۴۔ جنون و آشفتگی کا ایک خاص انداز

۵۔ خود کا شعور(۲۳)

ان خصائص کے تفصیلی تجزیے کا یہ محل نہیں تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی غزل میں ان عناصر کی حیثیت اساسی ہے۔ غالبؔ نے غزل میں جو مضمون و اسالیب کا جو طرز اختراع کیا اقبال نے نہ صرف اس کی توسیع بلکہ تکمیل کی۔ فتح محمد ملک کے الفاظ میں ''پرانی غزل کے نظامِ اقدار پر غالبؔ کے ہاں جو تشکیک نمودار ہوئی تھی وہ اقبال کے ہاں یقین میں بدل جاتی ہے۔ اقبال غزل کے خاکستر سے ایک نیا جہانِ غزل تیار کرتے ہیں۔''(۲۴) چنانچہ شیخ عبدالقادر کی یہ رائے جتنی برمحل ہے اتنی ہی مبنی برصداقت بھی ہے:

''کسے خبر تھی کہ غالبؔ مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا

جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالبؔ کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادبِ اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے؛ مگر زبانِ اردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ اس زمانے میں اقبالؔ سا شاعر اسے نصیب ہوا۔۔۔ اگر مَیں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کو اردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے؛ اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔'' (۲۵)

مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ابھرنے والے سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی ماحول نے اقبال کے فکر وفن کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے حالیؔ، اکبرؔ اور غالبؔ کو اقبال کے پیش رووں کی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کی شخصیتوں اور قابلیتوں کے مجموعی مواد سے اقبال کی منفرد اور نابغہ شخصیت وجود میں آئی جس نے اپنے معجز نما کلام کے ذریعے نہ صرف اپنی قوم کی ڈولتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا بلکہ اردو غزل اور نظم کو موضوعات اور اسلوب کے ایسے آفاق سے روشناس کرایا جو اس سے پہلے دریافت نہ ہوئے تھے اور یوں اردو ادب و شعر کو ایک نئے عہد میں داخل کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، 'اُردو تنقید کا رومانوی دبستان'، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع اوّل ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۸

۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، 'نئے تناظر'، آئینۂ ادب، لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۱ء، ص ۵۵

۳۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، 'اُردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر'، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۴۲۶

۴۔ محمد حسین آزاد، 'مقالاتِ آزاد' مرتبہ: آغا محمد باقر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۴۲۹

۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، 'شاعری کی سیاسی وفکری روایت'، دستاویز مطبوعات، لاہور، طبع اوّل ۱۹۹۳ء، ص ۲۶

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، 'نئے تناظر'، ص ۵۶

۷۔ افتخار احمد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر، 'عروجِ اقبال'، بزمِ اقبال، لاہور، طبع اول ۱۹۸۷ء، ص ۲۵

۸۔ ایضاً، ص ۴۵

۹۔ الطاف حسین حالؔی، مولانا، 'مقدمہ شعر وشاعری'، ساجد بک ڈپو، لاہور، س ن، ص ۲۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۸

۱۲۔ شیخ عقیل احمد، ڈاکٹر، 'غزل کا عبوری دور'، جے ڈی پبلی کیشنز، دلّی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۳

۱۳۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، 'غزل اور مطالعۂ غزل'، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۴۴۷

۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، 'غزل کے نئے افق' مطبوعہ ''اوراق'' لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۵۴

۱۵۔ محی الدین قادری زور، 'اقبال کا اثر اردو شاعری پر' مشمولہ 'اقبالیات کے نقوش' مرتبہ: ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع اول ۱۹۷۷ء، ص ۵۴۷

۱۶۔ نظیر صدیقی، 'میرے خیال میں'، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۵۹

۱۷۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، 'سرسیّد، اکبر اور ہمارے تہذیبی تقاضے' مشمولہ: ''تہذیب وتخلیق''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۹۲

۱۸۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، 'اکبر الہ آبادی کی فکری اساس' مطبوعہ ''ماہِ نو'' لاہور، اپریل ۱۹۸۷ء، ص ۱۶

۱۹۔ رشید احمد صدیقی، 'علی گڑھ میگزین'، اکبر نمبر، ۱۹۵۱ء، ص ۱۲

۲۰۔ طارق محمود ہاشمی، ڈاکٹر، 'اُردو غزل میں اسلوب، زبان اور ہیئت کے تجربات' تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی۔ شعبہ اُردو، جامعہ پشاور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۸

۲۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، 'مسائلِ اقبال'، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، طبع دوم ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۴، ۱۱۵

۲۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، 'دائرے اور لکیریں'، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، طبع اول ۱۹۸۶ء، ص ۲۹، ۳۱، ۳۴

۲۳۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، 'مسائلِ اقبال'، ص ۱۱۶

۲۴۔ فتح محمد ملک، 'غزل اور نئی غزل' مطبوعہ ''ادب لطیف''، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۵۹

۲۵۔ شیخ عبدالقادر، دیباچہ 'بانگِ درا' مشمولہ 'کلیاتِ اقبال' اُردو، مرتبہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع سوم ۲۰۰۰ء، ص ۳۵

☆☆☆